عرفان اسلامی میں مولانا رومی کا مقام

مؤلف: مولانا مہدی باقر خان

عرفان، خود شناسی سے خدا شناسی تک کے اس مقدس سفر کا نام ہے جس میں انسان کائنات و مافیہا کو چشم بصیرت سے دیکھتا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو انسانی جان و روح میں ایسے اثرات مرتب کرتا ہے کہ اس کا وجود، عشق الٰہی کا سراپا بن جاتا ہے اور پھر اس کا قد اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر آسمانی نشانیوں کا ادراک کرنے لگتا ہے. در اصل یہ انسانی حیات کا جوہر، معشوق حقیقی تک پہنچنے کا دلکش راستہ اور پاکیزہ عشق کا عملی کارنامہ ہے، چنانچہ عرفاء؛ اللہ کے علاوہ محض ان ہی کی محبت کو لازم جانتے ہیں جن سے خود اللہ نے محبت کی ہے۔ یہ خود پسندی کی بیماریوں سے بَری اور مادیت کے قید خانوں سے آزاد تاہم اسرار و اقدار بندگی کے اسیر ہوتے ہیں؛ ایسے عارف، عارف باللہ اور ایسا عرفان، عرفان اسلامی کہلاتا ہے۔

حسین انصاریان اس مقدس جذبہ کی اصل و بنیاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اس تفکر کے نقطۂ آغاز کی جستجو ایک غیر ضروری امر ہے کیونکہ یہ وہ حس ہے جو روز اول سے انسانی جان و روح میں موجود ہے فرق یہ ہے کہ بعض افراد اس حس کو بیدار کر لیتے ہیں اور بعض اسے اپنے اندر محسوس کئے بغیر ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں چنانچہ ہم خدا کو ہی اس کیفیت کا سرچشمہ پاتے ہیں جس نے بشری قلوب کو یہ صلاحیت ودیعت کی اور پھر اپنے مخصوص رہنماؤں کے ذریعے اسے وہ جلا بخشی تاکہ لوگوں کو عرفان حاصل ہو سکے ورنہ فکر بشری کی طنابیں ٹوٹ جاتیں اور اس تک رسائی نہ ہو پاتی"۔[1]

۱۔ حسین انصاریان، عرفان اسلامی، ص ۵

اسلامی تصوف یا عرفان دو الگ الگ حصوں پر مشتمل ہے جسے اس کی روح اور جسم کہا جاسکتا ہے۔ اس کی نوعیت ان دونوں حصوں کے باہمی ارتباط کو جاننے سے معلوم ہوتی ہے۔ دیوان شمس میں رومی کے اس پر تاکید اور مثنوی معنوی سے اس کی شروعات کے ذریعے، اسلامی تصوف و عرفان کی روح کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی؛ بانسری کی شکایت اور بادشاہ اور کنیز کی محبت کی حکایت سے شروع ہوتی ہے جو خدا اور انسان کے مابین والہانہ رشتہ سے مستعار ہے تاہم خدا کی محبت ہی روح تصوف و عرفان ہے۔

یہ محبت ہی ہے جو بانسری کو اس کے کشت زار کی مشتاق اور درد و فراق کی داستان کو بیان کرنے والی بناتی ہے اور اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی چاہت کا اشارہ دیتی ہے چنانچہ اگر تصوف و عرفان میں ایک قسم کی جمالیاتی حِس، نظر آتی ہے تو وہ بھی اس کے عاشقانہ نقطہ نظر کا طفیل ہے۔

ممکن ہے مذہبی متون میں محبت کو خدا کے ساتھ انسان کے تعلقات کی بنیاد کے طور پر صراحتا بیان نہ کیا گیا ہو مگر مکتب عرفانی، الٰہیات کے اس عاشقانہ اور جمالیاتی نظریہ کی نشاندہی کرتا ہے جس میں انسان اور اس کے معشوق حقیقی کی درمیان دو طرفہ عطوفتوں کے جذبہ اور احساسات موجزن ہوتے ہیں تاہم اسکا منبع خداوند کریم کی ذات والا صفات ہی ہوتی ہے:

آتش عشق است کاندر نی فتاد　　جوشش عشق است کاندر می فتاد[1]

ترجمہ: وہ عشق کی آگ ہی ہے جو نی یا بانسری میں روشن ہے اور یہ عشق ہی ہے جو می میں موجزن ہے۔

تاہم یہی محبت ہے جو انسانی بقا کی ضامن ہے، انسان؛ عشق، معرفت و عقلانیت ایسے کئی مخصوص جذبوں سے سرشار ہے جس سے فرشتے بھی بے بہرہ ہیں. یہی معرفت ہی وہ مقام ہے کہ جب تک انسان اس کے اعلی درجے پر نہ پہنچ جائے اور خدا اور اولیائے خدا کے سوا کسی سے دل نہ لگائے، وہ معشوق حقیقی سے محبت کے لائق نہیں بن پاتا لہٰذا عرفان اور اس کی روح کا سنگ بنیاد خدا کی معرفت پر مبنی محبت ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ عرفاء کے مطابق یہ معرفت و محبت کسی فرد کی ریاضتوں و مجاہدتوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ خدا خود اپنے مقربین کا انتخاب کرتا ہے:

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش اول، بیت ۱۱

عطار نیشاپوری کے بقول یہ نکتہ صوفی فکر کا ایک خاص پہلو ہے کہ حضرت حق کی عنایات و اور ہدایات اس کی رازدارانہ عطااور تحفہ ہے جسے محض اپنی کوششوں کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔[۱]

اپنے بندوں کی محبت پر خدا کی محبت کی مقدم ہے اس آیہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ[۲] سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ مقدس احساس اور والہانہ عنایت کا ادراک، عرفاء اور خداوند کریم کے مابین روابط کی راہ کو ہموار کرتا ہے اور صوفیا و عرفا کا سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ عشق اور محبت پر مبنی یہ رشتہ؛ عام طور سے معاشرہ میں رائج، عبادت گزار اور دیوتا کے درمیان زہد و تعبدِ خشک پر مشتمل رشتے کی جگہ لے لیتا ہے۔اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ قرب خدا کی مسلسل تلاش؛ تصوف کا اصول، روح اور ناگزیر نتیجہ ہے؛ چونکہ عارف باللہ کی اکلوتی خواہش اور اسکی خستگی ناپذیر جستجو، وصال اور لقاء اللہ ہوتا ہے۔اس پاکیزہ فکر کے پیش نظر، عارف؛ مذہب کو مقصد نہیں... وسیلہ مانتا ہے اور اس کے نزدیک مذہب؛ سختیوں کا نام نہیں بلکہ آسانیوں کی راہ بن جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ کائنات کو عشقِ الٰہی کے آئینے سے دیکھنے لگ جاتا ہے:

علت عاشق زِ علت ہا جداست　　عشق اسطرلاب اسرار خداست[۳]

ترجمہ: عشق کا سبب جملہ اسباب سے جدا ہے۔ عشق اسرار الٰہی کا لامتناہی اور نامحدود سلسلہ ہے۔

فروزانفر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

"چونکہ محبت؛ روح کو نرم اور دل کو معرفتوں کے لئے ہموار کر دیتی ہے، اس لئے رومی نے اسے ایک اسطرلاب (Astrolabe) کے ساتھ تشبیہ دی ہے"[۴]۔

عرفا کا دین اسی محبت کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اور دراصل ان کے یہاں محبت کو مذہب پر بالا دستی حاصل رہتی ہے اور وہ انکے لئے قرب خدا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا رومی کے نقطہ نظر اور عرفا کی رو

۱۔ عطار نیشابوری، فرید الدین محمد منطق الطیر، ص ۴۶۳
۲۔ سورہ مائدہ، آیت ۵۴
۳۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش ششم، بیت ۹
۴۔ فروزانفر، بدیع الزمان، شرح مثنوی شریف

سے عرفان اسلامی کی دو بنیادی خصوصیات ہیں: اول یہ کہ اس میں دین کے ظاہری آداب و رسوم سے زیادہ اس کے فلسفہ اور معنویت پر توجہ کی جاتی ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ انسان کو حضرت حق کی محبت کا اسیر بنا دیتا ہے اور یہ کیفیت اسے مشکلات سے نکال کے آسائش خاطر فراہم کر دیتی ہے، البتہ ہر شخص کی انفرادی صورت حال کے مطابق!

کشف و شہود

اسلامی تصوف کا دوسرا ابنیادی عنصر، کشف و شہود ہے جو منبعِ معرفت ہے۔ گوکہ یہ محض تصوف سے مخصوص نہیں ہے یہ فن اور فلسفہ میں بھی ہے، لیکن اس کی سب سے مکمل، باقاعدہ اور سب سے منظّم شکل عرفان و تصوف میں ہی نظر آتی ہے:

آن کہ از حق یابد او وحی و جواب ہرچہ فرماید بُوَد عین صواب[1]

ترجمہ: جسے حضرت حق سے وحی آتی ہو اور اس کے سوالوں کے جواب آتے ہوں، وہ جو کہے گا وہ بالکل درست کہے گا۔

حقیقت میں عرفا کا مقام بہت بلند ہے جیسا کہ امام صادق (ع) فرماتے ہیں: لیس العلم بالتّعلم، إنّما هو نورٌ فی قلب مَن یُرید الله تبارک و تعالی أن یهدیه ۔ ترجمہ: علم کسب محض نہیں ہے۔ یہ ایسا نور ہے کہ خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے دل میں اسے قرار دیتا ہے۔[2]

وحدت وجود

خدا وہ ذات ہے جس کے ساتھ عرفا راز و نیاز کرتے ہیں۔ خدا سے متعلق یہ نظریہ صوفیوں اور ادیان و مذاہب میں یقین رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے، حالانکہ ایک عارف کا خدا سے رشتہ اور

ا۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش نہم، بیت ۲۲۵
۲۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار (جلد ۱)، صفحہ ۲۲۵

مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا اپنے معبود سے ربط کی نوعیت مختلف ہے چونکہ ہر کس و ناکس عارفانہ نقطہ نظر کا متحمل بھی نہیں ہوتا ہے۔

سلوک

تصوف کا ایک اہم عنصر جو صوفیانہ طریقہ حیات کو عام طرز زندگی سے ممتاز کرتا ہے۔ سیر و سلوک یعنی، روح کے ساتھ مجاہدت، نفس پر قابو اور جذبہ اطاعت کے ساتھ اسکی راہ میں سراپا تسلیم ہونا ہے تاہم اس سفر کا آغاز، جہاں تک سالک کی کوشش کا تعلق ہے، توبہ سے شروع ہوتا ہے۔

کامل انسان

کامل انسان؛ عارف باللہ ہونے کی ایک مثال ہے مولانا رومی مختلف مقامات پر اس نکتے پر تاکید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

خود ضمیرم را ہمی دانست او زانکہ سمعش داشت نور از شمع ہو

بود پیشش سرّ ہر اندیشہ‌ای چون چراغی در درون شیشہ‌ای[1]

ترجمہ: وہ میرے مافی الضمیر سے آگاہ ہے چونکہ اس کی باطنی سماعت نورالٰہی سے مزین تھی۔اس پر ہر راز ہر نیت آشکارا تھی۔ ٹھیک اس چراغ کی طرح جو شیشہ میں ہوتے ہوئے سب کو شفاف طریقے سے دیکھ سکتا ہے۔

ظاہر ہے عرفان اسلامی کی صحیح تفہیم کے لئے سچے عرفاء کے احوال سے آشنائی ناگزیر ہے۔ دھیان رہے عرفاء کی سب سے اہم خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ کسی بھی راستہ سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں وہ ذات خداوندی میں سب کچھ پالیتے ہیں وہیں ساری چیزوں میں خدا کو تلاش کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اگر ہم عرفان کے حوالے سے ادبی دنیا میں بھی اس کے آفاقی نقوش و اثرات تلاش

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر چہارم، بخش دوم، بیت ۲۹۴

کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں ایسے ایسے نوابغ روزگار موجود ہیں جن کی مثال اس عہد قحط الرجال میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہے، مثلاً ابوسعید ابوالخیر (متوفی ۴۴۰ھ) ادبیات عرفانی کا اتنا معتبر نام ہے کہ ان کے ایک قول سے جو کہ مذکورہ خصوصیت کے عرفا کے تناظر میں ہے، ان کی عظمتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ دنیا کا ذرہ ذرہ خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

ظاہر ہے کہ خداجوئی اور توحید پرستی کا ایسا آفاقی نقطۂ نظر اسی کا ہوسکتا ہے جو کائنات کی تمام مخلوقات بالخصوص انسانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل اور قوم و قبیلہ محترم جانتا ہو، چنانچہ عرفا ہمیشہ انسان دوست رہے ہیں، خدا کی اس اشرف مخلوق کو ہمیشہ مائل بہ ارتقاء دیکھنا پسند کیا ہے انسان سازی کی عملی کوششیں کرتے ہیں اور مذہب کو انسان سازی کا بہترین وسیلہ قرار دیتے ہیں اور جو مذہب آدمی کو اچھا انسان نہ بنائے وہ اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتے یہی نہیں بلکہ عرفاء یہاں تک قائل ہیں کہ آدمی کا مسلمان و کافر، یہودی، بودھ اور زرتشت ہونے سے پہلے انسان ہونا ضروری ہے۔

عرفاء کے اس نقطۂ نظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو نہ فقط انسان بلکہ انسان کامل دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ اپنا خودشناسی سے خداشناسی تک کا سفر اسی نہج پر طے کرتے ہیں تاکہ اگر انسان کامل نہ بن سکیں تو انسان سالم تو ضرور بن جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ مائل بہ اصلاح رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں حسن ظن اور خودپسندی سے کام نہیں لیتے جیسا کہ ابوسعید کہتے ہیں:

"جو کوئی اپنے آپ کو نیک خو تصور کرتا ہے خود کو نہیں پہچانتا۔"

اس موقع پر اگر امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی حدیث من عرف نفسہ فقد عرف ربہ[1] یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا، دہرائی جائے تو بات مکمل نظر آتی ہے۔ البتہ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی حد تک انتہائی نقاد ہوتے ہیں مگر دوسروں کے سلسلے میں از حد پاک بیں ہوتے ہیں، انہیں دنیا کی کوئی چیز معیوب نظر نہیں آتی بلکہ وہ اسے ایسے مثبت اور تعمیری نقطۂ نظر سے دیکھتے

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، حضرت علی علیہ السلام

ہیں کہ وہ خوبصورت ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے جو بقول بو علی سینا: "عرفاء اور صوفیاء ظاہراً ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں"۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں مولانا جلال الدین بلخی معروف بہ رومی (متوفی ۶۷۲) کے افکار ہمیشہ سرفہرست میں رہیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی مثنوی کے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

خیر مطلق نیست زین ہا ہیچ چیز شر مطلق نیست زین ہا ہیچ چیز[1]

ترجمہ: دنیا کی کوئی شئے خیر مطلق یا شر مطلق نہیں ہے۔

یعنی کوئی چیز نہ خیر مطلق ہے اور نہ شر مطلق، ظاہر ہے کہ یہ وہ طرز فکر ہے جو عرفا میں ہی پائی جاتی ہے ورنہ دنیا میں اکثریت کے نظریات بہت اچھے یا بہت خراب کے افراط و تفریط کے شکار ہیں مگر عرفاء کے عارفانہ نقطہ ہائے نظر انہیں ایسا توازن و اعتدال بخشتے ہیں کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں تاہم یہ عارفانہ خصوصیت و امتیاز دنیائے ادبیات میں مولانا روم کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا روم نے مثنوی معنوی نامی اپنی مثنوی میں عرفانی اشعار کے وہ گہر پارے تراشے ہیں جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بعضوں نے اس مثنوی کو "صیقل الارواح" کا نام دیا ہے۔ کیوں نہ ہو مولانا نے آیات و احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے عرفانی اور اخلاقی موضوعات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے انسان سازی کے تئیں ان کی دل سوزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا وہ مفکر ہیں جو اپنی قوت فکر سے تمام مادی اور معنوی ظواہر کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کے عوارض کو الگ کرکے حقائق دریافت کر لیتے ہیں، کثرتوں میں وحدت تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی کو دکان وحدت اور دکان فقر قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے زندگی کی ناسازگاریوں اور ناہمواریوں کو توازن جانا ہے، فلسفہ توحید و حیات کا یہ تصور مولوی ہی کا حصہ ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

مثنوی ما دکان وحدت است غیر واحد ہر چہ بینی آن بت است[2]

۱۔ مثنوی معنوی، دفتر ششم، بخش ۸۴، بیت ۲۵۹۸

۲۔ مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۷۴، بیت ۱۵۲۸-۱۵۲۹

ترجمہ: میری مثنوی وحدت کا مخزن ہے۔ اس یکتا و یگانہ کے علاوہ اگر کچھ نظر آئے تو سمجھنا بت ہے۔

مولانا رومی، الٰہی احکامات کے پکے حامی ہیں در حالیکہ ان کی آزاد بینی انہیں ہر راستہ سے خدا تک پہنچادیتی ہے البتہ ان کے نظری استدلال و براہین انہیں خدا تک پہنچانے سے قاصر ہیں کیونکہ "پای استدلالیان چوبین بُوَد و پای چوبین سخت بی تمکین بُوَد"۔

رومی؛ عرفان خداوندی کے سلسلے میں "صاحب دل داند آن را با دلش" کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا روم، خدا اور انسان کے درمیان رابطہ کے سلسلے میں کسی معینہ موضوعیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی رو سے خود انسان کو اسے اپنی اصالت ذات و وجود میں تلاش کرنا چاہئے جس کو خالق و مخلوق کے درمیان نقطۂ ارتباط کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا خود کو سرحدوں، ملکوں اور جغرافیائی پابندیوں سے آزاد تصور کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے خود کو "باغ ملکوت" کا باشندہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

روزہا فکر من این‌ست و ہمہ شب سخنم — کہ چرا غافل از احوال دل خویشتنم
ز کجا آمدہ‌ام آمدنم بہرچہ بود — بہ کجا می‌روم آخر ننمایی وطنم
مرغ باغ ملکوتم نیم از عالم خاک — چند روزی قفسی ساختہ‌اند از بدنم[1]

ترجمہ: شب و روز مجھے یک فکر ستاتی ہے کہ میں اپنے احوال سے کیوں غافل ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں کیوں آیا ہوں۔ کہاں جارہاہوں۔ میرا وطن کہاں ہے۔ میں باغ ملکوت کا پرندہ ہوں۔ اس زمین کا باشندہ نہیں۔ یہاں میرے لئے صرف ایک پنجرہ ہے۔

علاوہ ازیں مولانا نے ایک اور مقام پر اپنی آفاقیت و ہمہ گیریت کو "لامکان" یا "بے جا" جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ دیوان شمس، غزل شمارۂ ۵۴

چہ تدبیر ای مسلمانان کہ من خود را نمی دانم — نہ ترسا نہ یہودم من نہ گبرم نہ مسلمانم
نہ شرقیم نہ غربیم نہ بریم نہ بحریم — نہ از کان طبیعیم نہ از افلاک گردانم
نہ از ہندم نہ از چینم نہ بلغار و سقسینم — نہ از ملک عراقیم نہ از خاک خراسانم
مکانم لامکان باشد نشانم بی‌نشان باشد — نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من از جان[1]

ترجمہ: اے مسلمانوں! میرے لئے کیا تدبیر ہے۔ میں نہ راہب ہوں نہ یہودی نہ گبر نہ مسلمان۔ نہ شرقی ہوں، نہ غربی ہوں نہ فطرت کے معدن سے ہوں نہ عالم افلاک سے۔ نہ ہندوستانی ہوں، نہ چینی نہ بلغار سے نہ سقسین سے۔ نہ عراق سے ہوں نہ خراسان سے۔ لامکانیت ہی میرا مکان ہے بے نشانی میرا نشان ہے۔ نہ تن رہے نہ جان کیونکہ میں جان جانان میں سے ہوں۔

مولانا رومی کی یہی عمیق، جامع اور دقیق وسعت نظر انہیں غیر معمولی اہمیت کے حامل فرزندان توحید کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور عرفانی ادبیات میں وہ مقام عطا کرتی ہے جہاں پہنچ کر انسان نہ صرف ناقابل فراموش بلکہ زندہ و جاوید ہو جاتا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی عرفان و تصوف پر گفتگو ہوتی ہے تو مولانا رومی ضرور یاد کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

۱۔ دیوان شمس، غزل ۱۱۶
۲۔ مبانی عرفان واحوال عارفان، ص ۴۷۵

منابع و مآخذ

- عرفان اسلامی، حسین انصاریان، ناصر خسرو، کوچہ حاج نائب، تہران، ۱۳۶۳ش
- مبانی عرفان واحوال عارفان، ڈاکٹر علی اصغر حلبی، اساطیر، میدان فردوسی، تہران، ۱۳۷۷ش
- نہج البلاغہ، کلمات قصار، ترجمہ مفتی جعفر حسین
- مثنوی معنوی، مولانا جلال الدین محمد بلخی (مولوی)؛ کریم زمانی، انتشارات اطلاعات، ۱۳۸۹، تہران
- عطار نیشابوری، فریدالدّین محمد، منطق الطیر، تہران